

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

اشارات

اکبر کے دین الہی کے بعد دوسری تحریک جس میں مسلمانوں کی حیات اجتماعی کو خالص الحاد کی بنیادوں پر استوار کرنے کی کوشش کی گئی وہ آنا ترک کی نام نہاد اصلاحی تحریک تھی۔ اس تحریک میں اس امر کا پورا پورا اہتمام کیا گیا کہ ملت اسلامیہ کی دینی وحدت کو پارہ پارہ کیا جائے اور مختلف ممالک میں جو مسلمان پھیلے ہوئے ہیں ان کے اندر نیشنلزم کے احساسات ابھار کر انہیں خاک وطن کی خاطر جدیا اور مرنا سکھایا جائے۔ مسلمانوں کے ملی مراکز جہاں سے انہیں قوت خدا اور اس کے رسولی کا پیغام ملتا ہے، انہیں یا تو منہدم کر دیا گیا یا پھر ان کی جگہ میوزیم اور مدارس قائم کیے گئے۔ اسلامی قوانین کو کیسے منسوخ کر کے ان کی جگہ فرانسیسی کوڈ اور جرمنی اور سوئٹزر لینڈ کے قوانین جاری ہوتے۔ ترکوں کو اپنے ماضی اور اس کی عظیم الشان روایات سے بیگانہ کرنے کے لیے عربی رسم الخط کو بدل دیا گیا۔ حتیٰ کہ عربی میں اذان اور نماز تک بھی ممنوع قرار پائیں۔ مختصراً اس انقلاب کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی تہذیب اور تمدن کو کیسے مٹا کر یہاں مغربی تہذیب و ثقافت کو فروغ دیا جائے تاکہ یہ ملک یورپ کے رنگ میں پوری طرح رنگ جائے۔

اس ضمن میں یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ دنیا کے سارے اسلامی ممالک میں اگر کسی ملک میں مغربی تہذیب کے لیے فضا کسی حد تک سازگار ہو سکتی تھی تو وہ صرف ترکی ہی تھا۔ یہ ملک یورپ سے بالکل ملحق ہے اس لیے یورپ کے اثرات اس میں بڑی آسانی کے ساتھ پہنچ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس سرزمین میں مغربی تہذیب کا علم اس شخص نے ملند گیا جسے

کسی حد تک ترکوں کا نجات دہندہ کہا جاسکتا ہے جو مغربی استعمار کے خلاف بڑی بے جگری سے لڑا اور ملک کی آزادی کے لیے بے مثال ایثار اور قربانی پیش کی۔ پھر ترکی میں مغربی تہذیب نے اس وقت قدم رکھا جو اس کے عروج کا زمانہ تھا۔ مغربی تمدن کے علمبردار اپنے اندر نئے نئے عزائم اور ولولے رکھتے تھے۔ خود اس تمدن کی خامیاں پوری طرح نمودار نہ ہوئی تھیں اس لیے ترکوں کا مغربی افکار و نظریات سے مرعوب و مشلوب ہو جانا بالکل فطری امر تھا۔

اس تحریک کو ملک میں کس حد تک کامیابی نصیب ہوئی اس کا ایک ہلکا سا اندازہ ان اخبارات و رسائل کی اطلاعات سے کیا جاسکتا ہے جو مغربی اقدار کے سب سے بڑے حامی ہیں اور انہیں دنیا میں کامیاب و کامران دیکھنے کے نہ صرف آرزو مند ہیں بلکہ اس راہ میں جدوجہد بھی کر رہے ہیں۔ تین ماہ قبل مشہور رسالہ ٹائمز میں اسی موضوع پر ایک طویل مضمون شائع ہوا تھا جس کے چند اقتباسات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

د مذہب کا ایجاد دوسرے ممالک میں ممکن ہے کہ ایک علمی بحث کا موضوع ہو لیکن ترکی میں یہ صورت حال ہرگز نہیں۔ یہاں اس کی سیاسی اہمیت ہے۔ ۱۹۲۰ء میں جب کمال اتاترک نے ترکی میں انقلاب کی بنیاد رکھی تو اس کا مقصد یہ تھا کہ اسلام کو اجتماعی زندگی سے خارج کر کے اسے غیر مذہبی بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ اس لیے ترکی میں اسلام کا ایجاد بڑے دور رس نتائج کا حامل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اتاترک نے ملک کی ترقی کے لیے جو اصلاحات تجویز کی تھیں یا جو منصوبے تیار کیے تھے وہ دریا برد کر دیئے جاتیں۔ یہ تمثیل اگرچہ مقصد کو پوری طرح واضح نہیں کرتی لیکن اس وقت مذہب کو زندہ کرنے کے لیے ترکی میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ نوعیت کے اعتبار سے انگلستان کی اس تحریک کی طرح ہوگا جو پارلیمنٹ کی برتری کے بجائے بادشاہ کی برتری کو بحال کرنے کے لیے

شروع کی جائے۔ آنا ترک کو اپنے غرام میں جو کامیابی نصیب ہوئی اس میں اس کے ذاتی اثر رسوخ اور ترک کی قومیت کے جوش و ولولہ کا بڑا عمل دخل تھا اور ان دونوں چیزوں نے مذہب کو وقتی طور پر شکست دے دی، لیکن جو نبی آنا ترک نظروں سے اوجھل ہوا اسی وقت مذہب کا احیاء شروع ہوا۔ آج پھر ابتدائی اور ثانوی سکولوں میں مذہبی تعلیم لازمی ہو گئی ہے۔ ریڈیو پر قرآن مجید کی باقاعدہ تلاوت ہوتی ہے۔ ائمہ کی تعلیم کے لیے جگہ جگہ مدارس کھولے جا رہے ہیں۔ انقرہ یونیورسٹی میں دینیات کا شعبہ قائم کیا گیا ہے۔ مذہبی کتب جو آنا ترک کے عہد میں بالکل ناپید تھیں اب بڑی تیزی کے ساتھ شائع کی جا رہی ہیں۔ رمضان کے مہینے میں مسجدوں میں بے حد رونق ہوتی ہے۔ انقرہ کے عین وسط میں ایک اسلامی مرکز قائم کرنے کی تجویز ہے جس میں ایک عظیم الشان مسجد، ایک بہت بڑا مدرسہ اور ایک وسیع دارالمطالعات قائم کیے جائیں گے۔ اس مرکز کے علاوہ ۱۹۵۰ء سے آج تک ترکی میں پانچ ہزار نئی مساجد تعمیر ہوئی ہیں ان میں پچاس صرف انقرہ میں ہیں حکومت ان مساجد کو جمادادے رہی ہے اس کا پوری طرح اندازہ نہیں کیا جاسکتا مگر ایک بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ وہ اچھی خاصی رقم ہے۔ ائمہ کی تعلیم و تربیت کے لیے جو مدارس قائم ہوئے ہیں ان کی تعداد میں بھی بڑی سرعت کے ساتھ اضافہ ہوا ہے ۱۹۵۱ء میں اس قسم کے مدارس صرف سات تھے اور اب ان کی تعداد انیس تک پہنچ گئی ہے ان مدارس سے ہر سال ساڑھے چار ہزار نوجوان خارج التحصیل ہو کر نکلتے ہیں۔ ان اداروں میں زیادہ تر عربی، فارسی اور دینیات کی تعلیم دی جاتی ہے۔

مغربی اقوام میں ترکوں کی اس مذہبی بیداری کا جو رد عمل ہو رہا ہے اس کو بھی ذرا ملاحظہ

فرمائیں۔

بہت سے ترک مفکرین اس صورتِ حال پر سخت پریشان ہیں۔ پارلیمنٹ میں اس موضوع پر جو مباحثے ہوتے ہیں اُس میں حزب اختلاف نے برسراِقتدار پارٹی پر ہمیشہ مذہب کی حمایت اور تعاون کا الزام لگایا ہے۔ موجودہ حکومت کے قیام کے بعد تمام وہ مذہبی عناصر جو اتاترک کے عہد میں غائب ہو گئے تھے اب پھر نمودار ہو رہے ہیں۔ لیکن اس معاملہ میں لطف کی بات یہ ہے کہ یہ حزب اختلاف جو اتاترک کی اصلاحات پر دل و جان سے فریفتہ ہے وہ بھی مذہب کی کھل کر مخالفت نہیں کر سکتی کیونکہ اسے اس بات کا پورا یقین ہے کہ ایسا کرنے سے آنے والے انتخابات میں وہ زیادہ ووٹ حاصل نہیں کر سکیگی۔ ترکی چھو رہا ہے اور عوام مذہب کا احیا چاہتے ہیں۔ اتاترک نے لوگوں کی رہنمائی کی تھی لیکن آج عوام اپنے سربراہوں کی قیادت فرما رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اتاترک کی اصلاحات کو ابھی تک پوری طرح کا عدم نہیں کیا گیا لیکن ایک ایسے ملک میں جہاں اتاترک کو قومی ہیرو مانا جاتے اور جس کی تعریف و توصیف میں لوگ رطب اللسان ہوں وہاں مذہب کا احیا بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کیا اتاترک کے پیش نظر صرف ریاست اور مذہب کو ایک دوسرے سے الگ کرنا تھا یا اس کے سامنے اس سے بلند تر کوئی مقصد موجود تھا یعنی مذہب کا خاتمہ۔ اگرچہ اب یہ بات کہنا ایک نیشن سائین گیا ہے کہ اتاترک مذہب کا مخالف نہیں تھا لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ ترکی کا یہ ہیرو اس بات پر نچتہ یقین رکھتا تھا کہ ترکوں کو اُس وقت تک مغربی اقتدار کا پوری طرح پرستار نہیں بنایا جاسکتا جب تک کہ اسلام کی گرفت اُن پر سے ڈھیلی نہ ہو جاتے۔“ (ڈائمنز)

ترکی میں جو فوجی انقلاب ہوا ہے اُس کے بارے میں مغربی حلقوں میں جس مسرت اور

شادمانی کا اظہار کیا جا رہا ہے اُس کی وجہ یہ نہیں کہ اہل مغرب یہ سمجھتے ہیں کہ ترکی میں اس انقلاب سے ایک مضبوط قومی حکومت کا قیام ممکن ہو گا اور یہ حکومت جمہوریت کو ملک میں بحال کرنے میں زیادہ کامیاب ہوگی بلکہ اس خوشی کی اصل وجہ یہی ہے کہ اسلام کے احیاء کے لیے جو کوششیں کی جا رہی ہیں انہیں اب زیادہ قوت سے دیا جاسکے گا۔ ٹائمر نے اس انقلاب پر جو تاثر بیان کیا ہے وہ گہرے غور و فکر کا محتاج ہے :

”ترکی کسی انقلاب کی آغوش میں نہیں۔ انقلاب تو اس پر ۳۰ سال پیشتر آتارک کے عہد میں اچکا تھا۔ فوج اس وقت جو کچھ کہ رہی ہے وہ صرف یہ کہ عدنان مندریں کے دورِ اقتدار میں اسلام کا جو احیاء ہوا ہے اور اس طرح قوم آتارک کے بتلائے ہوئے اصولوں سے جس حد تک مٹی ہے اُسے اُن کی طرف پھر لوٹا دیا جائے۔ ترکی میں آج بھی ایک ہی لیڈر ہے یعنی آتارک، اور اس حقیقت کو فوجی انقلاب کے سب سے بڑے سربراہ نے اس بیان میں تسلیم کیا ہے جس میں اُس نے نہایت واضح الفاظ میں یہ کہا ہے کہ نئے دستور میں جسے یونیورسٹی کے اساتذہ ترتیب دے رہے ہیں ایک دفعہ یہ بھی ہوگی کہ مذہب کو سیاسی مقاصد کے حصول کا ذریعہ نہ بنایا جائے“

ٹائمر کے اس نقطہ نظر کی مشہور اخبار آبزور نے بھی تائید کی ہے۔ وہ لکھتا ہے :

”حریت پسند ترک اس بات سے خائف تھے کہ ملک میں مذہبی بیداری عام ہو رہی ہے۔ مندریں کیا بذات خود کوئی مذہبی آدمی ہے یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔ ہمارے لیے جو چیز اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ ترکوں کی اکثریت کے لیے جو ابھی تک اسلام سے وابستہ ہے۔ عدنان اور اُس کے رفقاء اسلام کے حامی اور علمبردار تھے اور عصمت افوندا اور اُس کی

پارٹی اتا ترک کے فدائی۔

ممکن ہے ایک سطح میں آنکھ کے لیے اکبر کے دین الہی اور اتا ترک کی اصلاحات کے خلاف جو ردِ عمل ہوتا ہے وہ کوئی اتفاقی حادثہ ہو لیکن وہ شخص جس نے ان حالات و واقعات پر ذرا گہرائی میں اتر کر مطالعہ کیا ہے وہ اسے کبھی بھی بخت و اتفاق سے تعبیر نہیں کر سکتا۔ ان اسلام دشمن تحریکات کی اپنی فطرت اور اپنے مزاج میں تباہی و بربادی کے پورے پورے سامان موجود تھے۔ تاریخ نے ان کے بارے میں جو فیصلہ کیا ہے وہ بالکل صحیح اور قانونِ قدرت کے عین مطابق ہے۔ یہ تحریکات وقتی اور ہنگامی حالات کے تحت ابھری تھیں۔ ان کے پیش نظر صرف وقتی مسائل تھے، مگر بد قسمتی سے ان تحریکات کے علمبرداروں نے انہیں مستقل اور پائیدار سمجھا اور جب یہ دیکھا کہ ان کا مزاج اسلام سے میل نہیں کھاتا تو دین کے اندر تحریف شروع کر دی۔ کچھ وقت کے لیے تو یہ جادو چل گیا، لیکن تھوڑی مدت گزرنے کے بعد جب حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آئی تو پھر لوگوں کی آنکھیں کھلیں اور انہیں معلوم ہوا کہ ان کے ساتھ بربر اقتدار گروہ نے نہایت شرمناک کھیل کھیلا ہے۔ اس احساس کے بعد ان میں ردِ عمل کا پیدا ہو جانا بالکل فطری امر تھا۔

ان صفحات میں اتنی گنجائش نہیں کہ اس موضوع پر کوئی تفصیلی بحث کی جائے۔ یہاں اس حقیقت کو صرف ایک مثال سے واضح کیا جاتا ہے۔ ایک ان پڑھ سے ان پڑھ مسلمان بھی اسلامی قومیت کے بارے میں اس قدر تو ضرور جانتا ہے کہ اسلام میں قومیت کا اصل اصول نہ اشتراکِ زبان ہے نہ اشتراکِ وطن، نہ اشتراکِ اغراض اقتصادی۔ بلکہ ہم مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس وسیع برادری میں جو جناب رسالت صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی تھی اس لیے شریک ہیں کہ مفاہیر کائنات کے متعلق ہم سب کے معتقدات

کا سرچشمہ ایک ہے اور جو تاریخی روایات ہم سب کو ترکہ میں ملی ہیں وہ بھی ہم سب کے لیے یکساں ہیں اسلام تمام مادی قیود سے بیزاری ظاہر کرتا ہے اور اس کی قومیت کا دار و مدار ایک خاص تہذیبی تصور پر ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ خاک و خون کے رشتے ایک مسلمان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے یا وہ ان علاقوں کا دشمن ہے بلکہ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے ساتھ وابستہ اور جوڑنے والی چیز وطن یا برادری نہیں بلکہ دین سے اور دین ہی اس کے اندر زندہ رہنے کی تڑپ اور بڑھنے اور پھیلنے پھولنے کے احساسات پیدا کرتا ہے اور یہ چیز ایک مسلمان کے دل و دماغ میں پوری طرح جاگزیں ہو چکی ہے۔

اتنا ترک نے جس وقت ہوش سنبھالا اس وقت چونکہ عیشینڈم کا زور تھا اس لیے اس نے یہ سمجھا کہ ترکوں کی نجات کا واحد راستہ بھی اسی مسلک کی پیروی میں ہے۔ اس نے وقتی جوش میں آکر خلافت کی قباچاک کر دی اور قومیت کی بنیاد وطن کو قرار دیا۔ چونکہ یہ نظریہ اسلام کے مزاج کے یکسر منافی ہے اس بنا پر اس "ترک ناداں" کو اسلام سے بغاوت کرنا پڑی۔ کچھ لوگ جن کی نگاہیں وقتی مسائل کے خم و پیچ میں ہمیشہ الجھی رہتی ہیں اور جو کسی مسئلہ کو بالغ نظری سے دیکھنے کے عادی نہیں ہوتے انہوں نے اس اقدام پر بڑی مسرت کا اظہار کیا۔ مغربی حلقوں میں بھی اس تبدیلی کا بڑے جوش و خروش سے خیر مقدم ہوا کہ چلہ اسلامی برادری سے ایک قوم تو کٹی لیکن اس انقلاب پر ابھی چند سال ہی گزرے تھے کہ خود یورپ کے اندر اس نیشنلزم کے خلاف بغاوت کا جذبہ نمودار ہونے لگا۔ زمان و مکان کی تسخیر نے دنیا کے مختلف گوشوں کو ایک دوسرے کے اس قدر قریب کر دیا ہے کہ اب انہیں محض وطن کی بنیاد پر زندہ رہنا مشکل نظر آتا ہے۔ اس صورت حال کے بدل جانے سے ترکوں کے اندر بالکل قدرتی طور پر یہ احساس پرورش پانے لگا ہے کہ ان کے رہنما جنہوں نے انہیں امت مسلمہ سے الگ کیا ہے کوئی صاحب نظر اور عاقبت اندیش لوگ نہ تھے بلکہ بڑے کم نظر تھے جنہوں نے انہیں بڑے غلط راستے پر

ڈال دیا۔ جب لوگوں کے اندر یہ احساس بڑھنے لگے تو لازمی طور پر ان میں رہنماؤں کے متعلق ایک عام بے اعتمادی سی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ قلت کے ان "خیر خواہوں" کے سارے کارناموں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ ترکی میں بھی یہی کچھ ہوا۔ آنا ترک نے ترکوں کے اندر نیشنلزم کے احساسات ابھار کر ایک اتنی بڑی حماقت کی ہے کہ مسلمان تو کیا غیر مسلموں نے بھی اس کی اس نا عاقبت اندیشی نہ روش پر نفرین کہی ہے۔ اس سلسلہ میں فلسفہ تاریخ کے مشہور مفکر پروفیسر آرنلڈ ٹائٹن بی کے تاثرات پڑھنے کے قابل ہیں۔ وہ اپنی تصنیف دنیا اور مغرب کے دوسرے باب میں آنا ترک کی اس حماقت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

”ترک اور بہت سی دوسری مسلمان قوموں نے نیشنلزم کو اپنا یا ہے۔ اس مرحلہ پر ہم اپنے آپ سے ایک سوال کرتے ہیں کہ مغرب کے اس ننگ دلانہ اور متعصبانہ نقطہ نظر کو جب ایک ایسی وسیع المشرب قوم اختیار کرے جس کی قومی روایات نے اسے یہ سبق دیا ہے کہ مسلمان خواہ کسی نسل سے تعلق رکھتا ہو، خواہ کوئی زبان بولتا ہو، خواہ کسی خطہ ارضی میں آباد ہو وہ ایک دوسرے کا بھائی ہے، تو اس کا حشر کیا ہو گا۔ اس جدید دور میں جس میں سائنس کے اکتشافات نے زمانہ و مکان کے فرق کو قریب قریب مٹا دیا ہے، جس میں اب مغربی تصورات اور اشتراکی نظریات ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں اور رنگ و نسل یا زبان کی بنیاد پر نہیں بلکہ محض آئیڈیالوجی کی اساس پر قومیتوں کی تشکیل کی جا رہی ہے، اسلام کا نظریہ اخوت اور اس کی روایات عہد حاضر کے تمدنی تقاضوں کو مغربی قومیتوں کی بہ نسبت بہتر طور پر پورا کر سکتی ہیں۔ نئے حالات میں جس میں دنیا کے مغرب چالیس چھوٹی چھوٹی آزاد قوموں میں منقسم ہے اس بات کا ہر وقت خدشہ موجود رہتا ہے کہ کہیں یہ آپس میں لڑ کر ختم نہ ہو جائیں۔ یہ بجا طور پر توجہ کی جا سکتی ہے کہ دنیا کے اسلام میں مغرب کا لایا ہوا قوم پرستی کا

یہ جنوں اسلامی روایات کی قوت و طاقت سے ختم ہو جائے گا یا کم از کم ٹرے نہ پائے گا۔ اس اٹھی دُور میں انسانیت کی نجات کے لیے انسانی اتحاد جتنا آج ضروری ہے اس سے پیشتر کبھی اس کی ضرورت اتنی شدت سے محسوس نہ ہوتی تھی۔

پروفیسر صاحب نے بڑی صراحت کے ساتھ یہ کہا ہے کہ دوسرے مسلمان ممالک اگر ترکی کی پیروی کریں گے تو خود اپنی تباہی و بربادی کا موجب بنیں گے۔ انہوں نے اہل پاکستان کو اس حرکت پر سخت متنبہ کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

”آپ اہل پاکستان کو ایک قومی ریاست میں پورا پورا اختیار حاصل ہونا ہے۔ ان کی یہ ریاست بڑی وسیع و عریض ہے اور بہت زیادہ گنجان آباد، ہندوستانی مسلمانوں کو آزادی کی قیمت ترکوں اور مصریوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ادا کرنی پڑی۔ تجربے اور مشاہدے نے انہیں مغربی نیشنلزم کی قیمت اور اس کے عیوب سے پوری طرح آشنا کر دیا ہے۔ پاکستان اور ترکی کے رہنے والے سیاسی میدان میں اب ایسے سبق حاصل کر رہے ہیں جو نہ صرف مسلمانوں کے لیے مفید اور کارآمد ہونگے بلکہ ایک دنیا ان سے پوری طرح فائدہ اٹھا سکے گی۔“

اقتیاسات ذرا طویل ہو گئے ہیں لیکن ان میں فاضل مصنف نے بڑی دیدہ وری سے مسلم قوم کی اس حماقت کا جائزہ لیا ہے جو اس نے مغربی نیشنلزم کو اختیار کرنے کے سلسلہ میں کی ہے۔ یہ احساسات اُس شخص کے ہیں جو مغرب کا پرستار ہے لیکن اس کے باوجود وہ اس حقیقت کو اچھی طرح جانتا ہے کہ دنیا کی کوئی قوم جس کی اپنی تہذیب ہو، جو اپنی روایات رکھتی ہو، جو ایک متعین اسلوب حیات کی علمبردار ہو اور جو انفرادی اور

اجتماعی زندگی میں اپنی مستقل اقدار رکھنے کا دعویٰ کرے وہ دوسری اقوام کی تقالی کر کے کبھی بھی دنیا میں پیپ نہیں سکتی۔ وہ ایک ایک قدم پر ٹھوکر کھاتی ہے اور ہر کام پر حادثات کا شکار ہوتی چلیں گے اندر نہ صرف یاس و فزولیت کے جراثیم پرورش پاتے ہیں۔ بلکہ اپنے آپ پر اعتماد بھی ختم ہو جاتا ہے۔

مصر ہو یا ایران، ترکی ہو یا پاکستان، ٹیونس ہو یا انڈونیشیا، ان سب کو اس وقت ایک ہی مسئلہ درپیش ہے کہ ان کے ہاں ایک مختصر سا طبقہ جسے بد قسمتی سے سیاسی اقتدار بھی حاصل ہے، وہ مسلمانوں کی عظیم اکثریت کو مغرب پرستی کی راہ پر ڈالنا چاہتا ہے لیکن قوم اس پر آمادہ نہیں ہوتی۔ برسرِ اقتدار گروہ جبر سے، قوت و طاقت سے اسے چند قدم ہانکتا ہے لیکن جلد ہی جب قوم کو اس راہ کے خطرات نظر آنے شروع ہوتے ہیں تو وہ گھبراتا ہو کر اپنی اصل منزل کی طرف لوٹنے کے لیے جدوجہد کرتی ہے۔ یہ مغرب زدہ طبقہ پولیس اور فوج کی مدد سے اُس کا راستہ روکتا ہے اور اس طرح آپس ہی میں کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ امت مسلمہ کی توہین اور صلاحیتیں کسی تعمیری اور مثبت کام پر صرف ہونے کی بجائے باہمی آویزش میں صرف ہو رہی ہیں۔ ہمارے نزدیک ملتِ بیضا کا اصلی روگ یہی ہے اور جب تک اس کا پوری طرح علاج نہیں کیا جاتا وہ ایک قدم بھی آگے کی طرف نہیں اٹھا سکتی۔

اس مقام پر ہم اس امر کی صراحت کر دینا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کا یہ مغرب زدہ طبقہ اسلام کے خلاف کھلم کھلا کارروائی نہیں کرتا بلکہ اسلام کو مٹانے کے لیے جو سازشیں بھی کی جاتی ہیں وہ سب اسلام کے نام پر ہی ہوتی ہیں اور اسی طریقہ کو تجربہ سے زیادہ مفید اور کارآمد پایا گیا ہے۔ یہ طبقہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں، اپنے آپ کو اسلام کا سچا خدائی

اور خیر خواہ ظاہر کرتا ہے لیکن جس اسلام کی محبت کا وہ اس قدر دم بھرتا ہے اُس کی جھلک نہ تو خود اُس کی اپنی زندگی کے کسی گوشے میں نظر آتی ہے اور نہ ہی اجتماعی زندگی کے لیے جو منصوبے تیار کیے جاتے ہیں ان میں اس کا کوئی نام و نشان ملتا ہے۔ یہ صورت حال قومی زندگی کے لیے حد درجہ خطرناک ہے۔ اس سے قوم کے اندر ذہنی حلقہ پیدا ہوتا ہے جس سے آہستہ آہستہ اُس کی ساری قومیں ختم ہو جاتی ہیں۔ اگر یہ لوگ اسلام سے کھل کر انحراف کریں تو معاملہ اتنا پیچیدہ اور تشویشناک نہ ہو لیکن ان حضرات کا یہ طرز عمل امت مسلمہ کے لیے ایک بہت بڑی مصیبت بن گیا ہے۔

آپ کسی اسلامی ملک کے برابر اقتدار طبقے کے اقوال اور احوال و اعمال کا جائزہ لیں تو آپ کو اس ذہنی انتشار کے بڑے نادر سے نادر نمونے ملیں گے۔ ایک طرف اسلام کی مدح و ستائش ہو رہی ہوگی، اسے دنیاوی اور اخروی زندگی کے لیے واحد ذریعہ نجات بتایا جا رہا ہوگا لیکن دوسری طرف اسلام جن چیزوں کو دنیا سے مٹانے کے لیے آیا ہے، ان کی بھی دل جان سے تائید ہوتی ہوگی اور معاملہ صرف لفظی تائید تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ ملک میں انہیں فروغ دینے کے لیے ہر ممکن کوشش بھی ہوتی ہے۔ کونسا ایسا مسلمان ہے جو اس حقیقت کو نہیں جانتا کہ اسلام نے رقص و سرود کو حرام ٹھہرایا ہے اور یہ چیزیں اسلام کے مزاج کے منافی ہیں۔ جو لوگ ان کے رسیا ہوتے ہیں۔ ان میں عملی قومیں ناپید ہوتی ہیں اور دینی نقطہ نظر سے وہ کسی کام کے نہیں رہتے۔ امت مسلمہ کے اندر ان خواہش کا پھیلنا ایک بہت بڑے خطرہ کی علامت ہے۔ یہ مرغ باد نما ہے جو ایک خطرناک طوفان کا پتہ دیتا ہے۔ یہ وہ حقائق ہیں جن سے ہم پوری طرح واقف ہیں لیکن انہیں جانتے ہوئے آج دنیا کے ہر مسلمان ملک میں انہیں ترقی دینے کے لیے پوری پوری کوششیں کی جا رہی ہیں اور ان میں پیش پیش وہ لوگ ہیں جن کے ہاتھ میں ملک کی زمام کار ہے۔ اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ ان خواہش

کے پھیلانے کو بھی اسلام ہی کی خدمت کا نام دیا جاتا ہے۔ اس اندوہناک صورتِ حال میں ایک عام مسلمان کا دل و دماغ جس حد تک پریشان ہوتا ہے اُس کا اندازہ وہ شخص بڑی آسانی کے ساتھ کر سکتا ہے جس نے کبھی بھی عام لوگوں سے مل جل کر اُن کے تاثرات معلوم کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ کسی بس سٹاپ پر کھڑے ہو جائیں۔ کسی گاڑی کے ڈبے میں بیٹھ جائیں، کسی اجتماع میں شریک ہوں تو آپ لوگوں کو اسی موضوع پر اظہارِ خیال کرتے بچنے پائیں گے۔ وہ خواہ اسلام پر پوری طرح عمل کرنے والے نہ ہوں لیکن اُن کے دل و دماغ اور احساس و وجدان میں اسلام کا وہی تصور ہوتا ہے جو انہیں حضورِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے حبیب القدر صحابہ رضی اللہ عنہم سے ملا ہے۔ جب وہ اس تصور کی روشنی میں "جدید اسلام" کو دیکھتے ہیں تو وہ سخت مضطرب ہو کر پکار اٹھتے ہیں:

”ایں نقشِ دیگر است“

مگر ان کے سربراہ انہیں ہر ممکن طریق سے یہ باور کراتے ہیں کہ اسلام درحقیقت یہی ہے، ملانے اپنی ذاتی اغراض کے تحت اسے تم سے چھپا رکھا تھا۔ یہ بات کبھی انہیں مطمئن نہیں کر سکتی۔ وہ یہ سمجھ نہیں پاتے کہ آخر قص و سرود اگر فی الواقع دین کا ایک لازمی جزو ہی ہے تو اسے آج تک انہیں رکھنے کی کیا مصلحت تھی اور اس سے ملا بے چارے کو کون سے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

اس مغرب زدہ طبقہ کی پوری توجہ عرصہ دراز سے صرف اسی ایک نقطہ نظر پر مرکوز چلی آ رہی ہے کہ کسی طرح مغربی تہذیب اور اسلامی تہذیب کے درمیان جو حجابات موجود ہیں انہیں ختم کر دیا جائے۔ یہ لوگ درحقیقت مغربی اقدارِ حیات کے ہی پرستار ہیں لیکن چونکہ ان کی براہِ راست تبلیغ کرنے سے اُن کا اقتدار خطرے میں پڑتا ہے اس لیے وہ انہیں اسلام کا نام لے کر پھیلاتا چاہتے ہیں اور جب انہیں کوئی یہ کہتا ہے کہ یہ چیزیں جنہیں تم اسلام کہتے

ہو اسلام میں موجود نہیں تو وہ فوراً یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ اسلام میں تو بڑی وسعت و وسعت کے نام نے اس کا نثرہ خواہ مخواہ تنگ کر دیا ہے۔ ان حضرات کو اسلام کے کسی ایسے جزو پر اعتماد نہیں جس کی تائید مغربی فکر سے نہ ہو سکے۔ اسلام ان کے نزدیک ایک بے بس غلام ہے جس سے جتنا چاہا کام نکال لیا اور جسے جہاں چاہا بڑی بے تکلفی کے ساتھ استعمال کیا۔ اس طرز فکر کو آپ مسلمانوں کی پوری منسوب زدہ ٹیڈرشپ کے اندر بڑی آسانی کے ساتھ دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں ہم صرف اُس کی ایک مثال پیش کرتے ہیں۔

جنرل ناصر جب اپریل میں پاکستان تشریف لائے تو انہوں نے اسلامی تہذیب اور اس کی رہنمائی کو بڑے اچھے انداز میں سراہا لیکن انہیں خود اسلام پر جو اعتماد ہے اُس کا اندازہ اُس جواب سے کیا جاسکتا ہے جو ان سے اسلامی بلاک کے سلسلہ میں پوچھا گیا۔ ایک اخباری نمائندہ نے اُن سے کہا کہ کیا آپ ایک مسلم بلاک کی تشکیل کے حق میں ہیں؟ اس پر انہوں نے فرمایا کہ مذہب کو قومی یا بین الاقوامی سیاست کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا۔ البتہ وہ اس کے حق میں ضرور ہیں کہ مسلم ممالک کے درمیان زیادہ سے زیادہ رابطہ ہو کیونکہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ روحانی رشتے میں بندھے ہوئے ہیں۔

یہ ہے اس قسم کے حضرات کا اُس دین پر اعتماد جو زندگی کے سارے گوشوں کا احاطہ کرتا ہے، جو فکر و نظر کی انتہائی بلندیوں سے لیکر افعال و اعمال کی معمولی سے معمولی جزئیات تک ہماری نہ صرف رہنمائی کرتا ہے بلکہ انہیں ایک خاص سانچے میں ڈھالتا ہے، اور اس طرح ایک مخصوص تہذیب و تمدن کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔

دنیا کا ہر تمدن جو اپنے پیش نظر ایک انقلابی پروگرام رکھتا ہو وہ اس نیم دلائے واپس لگتی کو کبھی بھی گوارا نہیں کرتا۔ اس کے اندر تخلیقی قوت اُسی وقت تک موجود رہتی ہے جب تک اُس کی اپنی روح اُس کے مختلف شعبوں کے اندر جاری و ساری رہے اور جب بھی کسی تمدن میں باہر سے

ایسے عناصر شامل کیے گئے جو اُس کے فراج سے مناسبت نہ رکھتے تھے اُس وقت وہ تمدن تباہ ہوا۔ اس سلسلہ میں یوں تو بہت سے شواہد موجود ہیں لیکن یہاں ہم صرف دو مفکرین کی آراء پیش کر کے بات ختم کرتے ہیں:

۱۔ ہرنہذیب اپنے آپ میں ایک وحدت ہوتی ہے، اس کا آرٹ، مذہب، طرز رہائش، معاشی اور صنعتی ترقی، یہ سب شعبے ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہیں مجھے اس امر میں شک ہے کہ کوئی قوم بھی حسبِ مشائخِ تمدن کے عناصر کے اندر انتخاب کرنے میں کامیابی حاصل کر سکتی ہے۔ مثال کے طور پر کیا اہل مشرق یہ کہہ سکتے ہیں: ہم مغرب سے صرف اُس کے بڑے بڑے جہاز، اس کے کارخانے اور طبی ایجادات تو میں گے لیکن اُس ذہنی انتشار، اُس برقی رفتاری اور اُس تمدنی خلفشار سے بچ سکیں گے جو مغربی تہذیب کے لازمی تقاضے ہیں؟ (ڈولس ڈکلسن)

حقیقت یہ ہے تہذیب مختلف اجزا میں منقسم نہیں ہو سکتی۔ مثال کے طور پر دنیا سے مغرب کو دوسری دنیا پر جنگی میدان میں جو برتری حاصل ہے اُس کی وجہ وہ اسلحہ اور عسکری تربیت نہیں، جن سے اہل مغرب واقف ہیں اور نہ ہی محض صنعتی ترقی کو اس کی علت قرار دیا جا سکتا ہے اسے پوری طرح سمجھنے کے لیے ہمیں مغربی سوسائٹی کی روح کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اہل مغرب کی جنگی تدا بیر اُن کے تہذیبی مظاہر ہی کا حصہ ہیں۔ لہذا ایک ایسی سوسائٹی جس نے اٹنے کے مغربی طریقوں کو مغربی تہذیب اپنائے بغیر اختیار کرنے کی کوشش کی ہے وہ سخت ناکام ہے۔۔۔ (آرنلڈ ٹیٹن بی)

پچھلے مرتبہ ماہ اپریل کے پرچم پر غلطی سے مئی ۱۹۶۰ء طبع ہو گیا تھا۔ مئی ۱۹۶۰ء کے پرچم میں بھی اس کی معذرت تبصرہ میں فروگزاشت ہو گئی۔ لہذا خریدار اور ایڈیٹ حضرات درست فرمائیں۔ (دہلی)